ڈاکٹر نازیہ ملک
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو، نمل، اسلام آباد۔

ناول "گل مینہ" ایک تجزیاتی مطالعہ

Dr. Nazia Malik
Assistant Professor, Urdu Department, NUML, Islamabad.

An Analaytical Study Novel “Gul Mina”

Zeif Syed's second novel is Gul Meena in which he deals with the attitudes of war-affected people and their circumstances and events as well as the oppression and tragedy of a woman. Explains what kind of psychological problems arise in a society in a state of war.Situations and events in Gul Mina reach from Pakistan to Afghanistan and Malik Alamut. This novel also tells a romantic story in which Gul Mina and Zarjanan become the two main characters and capture the whole story. Many lands capture the times and the stories based on them. The article under review presents an analysis of this novel in the above context.

Key Words: *Gul Mina. National and religious conflict. Afghan war. Customs and traditions. Hassan bin Saba Taliban War tendencies. Terrorism. Historical Fine Arts. Suffering and problems.*

زیف سیّد مانسہرہ کے ایک قبائلی علاقے میں ۱۹۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں سے حاصل کی اور پھر مختلف سنین میں مختلف ڈگریاں حاصل کیں۔ ملازمت کا آغاز ۲۰۰۵ء میں وائس آف امریکہ میں بطور ویب ایڈیٹر سے شروع کیا۔ زیف سیّد کو بچپن ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا لیکن آپ نے باقاعدہ اپنے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۹۶ء سے کیا۔ انھوں نے بہت سی نظمیں اور غزلیں لکھیں جو مختلف رسائل و جرائد اور ویب سائٹس پر موجود ہیں۔

ابتدائے ادب میں ہی وہ ایک کہنہ مشق استاد ادیب کی طرح ادبی حلقوں میں اپنے فن اور قابلیت کی دھاک بٹھاتے ہوئے وارد ہوتے ہیں۔ ایک صحافی ہونے کی حیثیت سے صرف ان ہی کی آنکھ ہی معاشرے کے در پردہ پہلوؤں اور دن بہ دن بڑھتے ہوئے انتشار اور ہر طرح کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی برائیوں کو دیکھ سکتی ہے۔ ان کی پہلی کتاب ۲۰۰۴ء میں "پاکستان میں سرطان" کے نام سے شائع ہوئی۔ علاوہ ازیں انھوں نے بہت سارے

افسانے اور مضامین لکھے جو ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ہیں۔ لیکن ان کو ابھی کتابی شکل میں نہیں ڈھالا گیا۔ دیگر تمام تحریروں کی طرح ان کے ناولوں کو بھی ادبی حلقوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ ان کا سب سے پہلا ناول "آدھی رات کا سورج" ہے جس میں انھوں نے مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان رقم کی ہے۔ ان کا دوسرا ناول "گلِ مینہ" ہے جس میں انھوں نے جنگ سے متاثر ہونے والے لوگوں کے رویوں اور انھیں درپیش حالات اور ان کے بے بہا مسائل کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی مظلومیت اور لمنا کی کو پینٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔

انھوں نے اس ناول میں یہ بتانے کی کوشش بھی کی ہے کہ حالتِ جنگ میں ایک معاشرے کو کس قسم کے نفسیاتی مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

زیف سیّد نے اپنے ناول کے کرداروں کے ذریعے سے قومی و مذہبی تصادم اور جنگ و جہاد کے نقصانات اور اہمیت کو واضح کیا ہے۔ انھوں نے گلِ مینہ، شفیق، زرجانان اور فتح خان کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ و جہاد جب مذہبی یا نسلی بیانیے پر استوار ہوں تو اشرافیہ نظام کو عظمت حاصل ہو جاتی ہے۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ مذہبی لبادہ اوڑھ کر عوام الناس پر ان کی پاکیزگی کی دھاک بٹھانے کے لیے وہ مذہبی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں۔ آخر کار نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام غلامی کے کنویں میں ڈوب کر اپنی عزت و آبرو کا مژدہ سناتی پھرتی ہے۔

زیف سیّد نے جس طرح اس ناول کی کہانی کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے ان میں یہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے کہ مذہب، قوم اور نسل کی بنیاد پر لوگوں میں اجتماعیت کا احساس تو پیدا کر سکتے ہیں لیکن یہ اجتماعیت اپنے مفاد کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ انھوں نے یہ چیز باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ قومی و مذہبی اور نسلی اشرافیہ کے تحفظ کے علاوہ اسے کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا ہے، جنگ و جدل میں جو لوگ اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہیں وہ اس چیز سے بے خبر ہوتے ہیں کہ وہ جس اشرافیہ کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، اس کا تو اختتام ہی بارود او رگندگی کے ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں۔

> "اگر آپ ان میں سے کسی بھی شرط سے روگردانی کریں گے تو آپ کے علاقوں پر وسیع پیمانے پر فضائی بمباری ہو گی جس کے بعد زمینی فوجی حملہ کر کے سرکش قبائل کے خلاف کارروائی کی جائے گی جس میں دیہات کی مسماری، فصلوں کی تباہی اور دیگر اقدامات شامل ہیں۔"(۱)

اگرچہ ناول کا مرکزی کردار گلِ مینہ اور کا خاوند اور بیٹا ایک عام سی زندگی گزارتے ہیں مگر ان تک بھی جنگ و جدل کا سامان پہنچ جاتا ہے۔ زیف سیّد نے جس معاشرے کو ناول میں پیش کیا ہے وہاں رنگ و نسل، قوم و مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیوں کہ اس معاشرے میں پچاس روپے میں بیوی بنانے کے لیے عورت مل جاتی ہے۔ جان لینے اور جان دینے کے لیے ہزاروں لوگوں کا مجمع اکٹھا کر لیا جاتا ہے، معاشرے کی ان تمام برائیوں کے پسِ منظر میں زیف سیّد نے معاشرے کی بے حسی کو اجاگر کیا ہے۔

زیف سیّد کا ناول معاشرے کی بے حسی کے علاوہ ایک تاریخی حوالے سے بھی سامنے آتا ہے انھوں نے اس ناول میں حسن بن الصباح کی تحریک اور افغان جنگ کو تاریخی اعتبار سے جس طرح بیان کیا ہے وہ محض خود کش بمباروں اور ان کی ہولناکیوں کا ذکر نہیں ہے بلکہ اس ناول میں معاشرے میں موجود ایسے بیانیے کی کڑیاں ہیں جنھیں اب تک کسی نے بھی نہیں للکارا۔ شفیق پینٹر اور حسن بن الصباح کی بنائی ہوئی جنت کا حصول صرف موت ہی مانگتی ہے، کیوں کہ موت کے بغیر کوئی بھی جنت میں نہیں جا سکتا۔ اس لیے لوگوں نے فدائی یا مجاہد کے طور پر ناول میں اپنی اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔ جو اس بات کی واضح دلیل ہے کہ لوگ کس طرح مذہب کو اپنے ہر جائز و ناجائز مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ دنیا میں جتنی بھی لڑائیاں بپا ہوئیں اور جتنے بھی لوگوں کی جانیں گئیں یہ انسانیت کے منہ پر تماچہ ہے ہی لیکن ان کے پیچھے کہیں نہ کہیں ایسے لوگ موجود ہیں۔ جنھوں نے مذہبی کارڈ کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ وہ ہیروشیما کی تباہی ہو، ہندوستان کا دولخت ہو جانا یا افغانستان میں روس جیسے سپر پاور کی مداخلت۔

ناول میں کرب کے عناصر اس وقت سامنے آتے ہیں جب ایک مجاہد کی ماں جو اپنے بیٹے کی لاش پہ بلکتی نظر آتی ہے۔ گلِ مینہ کا شوہر بم دھماکے میں جان گنوا دیتا ہے۔ اسی طرح ان کا بیٹا فتح خان بھی خود کش دھماکے کے ذریعے خود کو اڑا دیتا ہے۔ گلِ مینہ کو اپنے شوہر کا خون تک دیکھنے کو میسر نہیں ہوتا مگر وہ بیٹے کی کھوپڑی دیکھنے کی آرزو میں جہنم میں مرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اور پھر گلِ مینہ کی نظریں ایک مرتبان پر جم گئیں۔ اس کے قدموں تلے فرش بہتے دریا میں چلتی کشتی کی مانند ہچکولے کھانے لگا، جیسے اب الٹا کے تب الٹا، اسے ایک بار پھر گرنے سے بچنے کے لیے میز کا سہارا لینا پڑا۔۔۔ گلِ مینہ نے دیکھا کہ مرتبان کے سیال

میں تیرتے ہوئے اس کے سیاہ چمک دار بال روشن ماتھے پر سرسرا رہے تھے۔
۔۔۔وہی ماتھا جسے اس نے ہزاروں بار چوما ہو گا۔"[۲]

اس ناول کا لوکیل بتاتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے حالات و واقعات کو پاکستان اور افغانستان تک پھیلایا ہوا ہے۔ اس ناول میں وقفے وقفے سے نئے کردار کہانی میں نیا واقعہ پیش کر دیتے ہیں۔ احمد شاہ ابدالی کی جھلک اپنا منظر پیش کرتی ہے تو کہیں قبائلی عمائدین کی لڑائی میں پیار کے دروازے وا ہوتے ہیں۔ جہاں قبیلے کے رسوم و قیود سے دونوں نوجوان فرار ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہیں ہمیں کوئی کڑیل جوان کافروں کے جہاز مارتا دکھائی دیتا ہے اور کہیں ناول میں ہمیں حسینائیں جنت کی ٹکٹ کے حصول کے لیے حسن کی ادائیں دکھاتی پھرتی نظر آتی ہیں۔

ملا عمر کے طالبانوں سے حسن بن الصباح کے فدائین تک، شفیق پینٹر سے خودکش مجاہد فتح خان تک پورے ناول میں کئی طرح کے کردار نظر آتے ہیں۔

پھر بھی مرکزی کردار ان ضمنی کرداروں کے جھرمٹ میں ناول میں ابتدا سے اختتام تک نمایاں رہتے ہیں۔ ان کی حیثیت ناول میں شروع سے آخر تک ایسے رہتی ہے جیسے وہ اپنے معیار کو گرنے کی بجائے سنبھالنے میں مشغول ہوں۔

ناول نگار نے جہاں ناول میں جنگ و جدل طبقاتی نظام اور بے حس معاشرے کو آئینہ دکھایا ہے وہیں انھوں نے رومانوی عناصر کو بڑی آب و تاب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول میں رومانوی عناصر تب اپنی شوخی دکھاتے ہیں جب زرجانان اور گل مینہ کی محبت کی داستانیں قبیلے میں گونجتی ہیں۔ ناول میں کرداروں کے ذریعے مختلف خاندانوں اور مختلف قبیلوں کے لوگوں کو نہ صرف پیش کیا گیا ہے بلکہ ان کے ذریعے جنگی رجحانات، معاشرے کے اتار چڑھاؤ اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا حیرت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے مکالماتی انداز میں جنگی رجحانات کے ساتھ ساتھ معاشرے میں آئے روز پیش آنے والے واقعات کو بھی دکھایا ہے۔

"دروازے پر زرجانان کی مخصوص دستک ہوئی۔ گلِ مینہ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔
اتنی جلدی آ گئے، پھر راستے میں لڑائی ہو رہی ہے؟ صبح میں نے فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ ہاں، لڑائی ہی لڑائی، سواریوں کا نام و نشان نہیں۔ سب ڈرائیور گاڑیاں بند کر کے گھروں کو چلے گئے۔"[۳]

اس ناول میں اگرچہ ناول نگار لبرل بیانیے سے کرداروں کو واقعات میں پیش کرتا ہے مگر یہ ناول لبرل بیانیے پر فٹ آتا دکھائی نہیں دیتا۔ اس کے علاوہ بھی ناول نگار کا عمیق مطالعہ اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ انھوں نے تاریخ کا بے پناہ مطالعہ کیا ہے اور پھر اپنے اس تجربے کو ناول کے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے۔ ناول نگار کو یہ بات ازبر ہو گئی ہے کہ تاریخ اور ناول میں کیا فرق ہے۔ انھوں نے فکشن اور تاریخ دونوں کو ایک ساتھ گوندھ کر گلِ مینہ کا خمیر تیار کیا ہے اور اس کا ڈھانچہ اس طرح سے تیار کیا ہے کہ اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ ہم ناول پڑھ رہے ہیں یا کوئی تاریخی کتاب، مکالماتی فضا اس قدر جاندار ہے کہ قاری اس خاص بیانیے کو جو ناول میں سمو دیا گیا ہے سے اپنے ہی اندر مکالماتی فضا قائم کر لیتا ہے۔

اقتباس ملاحظہ ہو:

> "زرجنان! اب کیا ہو گا؟ ہم کہاں جائیں گے؟ ہم سے بڑی غلطی ہوئی ہے، ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ لوگ ہمیں کبھی جیتا نہیں چھوڑیں گے، ارے ان کی فکر مت کرو، گلِ مینہ وہ ہمیں زندگی بھر چھو بھی نہیں سکیں گے۔"[۴]

زیف سیّد نے ناول میں بہت سے سوال پیش کر کے خود ہی ان کے جواب دینے کی کوشش کی ہے، ناول کے بنیادی تھیم کی طرف غور و فکر کی جائے تو یہ ناول ہمیں پختون قوم کی تاریخ کا نفسیاتی و معاشرتی مطالعہ دکھائی دیتا ہے، احمد شاہ ابدالی جسے سرحد کے دونوں پار پختون اپنا بابا سمجھتے ہیں۔ انھیں بھی ناول میں ڈی کنٹریکٹ کہا گیا ہے۔ اسی طرح ناول میں پاوٗ جان جو پختونوں کا زندہ و جاوید ماضی ہے اس سے بھی تاریخ کے چند ورق چھانتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان دو تاریخوں کے درمیان ناول میں صرف ایک ہی کردار ہے جو متحرک نظر آتا ہے۔ اس کی بے بسی کو ناول نگار نے نمایاں انداز میں بیان کیا ہے جو گلِ مینہ کا کردار ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کی زندگی اور کہانی کے ساتھ ناول نگار خود ذاتی طور پر وابستہ ہے اور ناول نگار کو اس سے بے حد ہمدردی ہے۔ پتھر کے زمانے میں کانچ کی گڑیا سی یہ لڑکی بہت باہمت کردار کے طور پر نمودار ہوتی ہے جس نے ہزارہا مصائب اور آلام جاں سے گزرنے کے بعد بھی ہمت نہیں ہاری۔ اس پہ صدموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں لیکن مجال ہے کہ اس کی ہمت کی یہ سیسہ پگھلائی دیوار کہیں ذرا سی دیر کو بھی ٹس سے مس ہو۔ گلِ مینہ ایک ایسے قبائلی علاقے جو کہ حالتِ جنگ میں ہے کی نمائندہ کردار ہے۔ جہاں عورت کو زور سے کھانسنے تک کی بھی اجازت نہیں ہوتی اور تمام سزائیں اور تعزیریں صرف عورت کی ذات پر ہی لاگو ہوتی ہیں لیکن یہ ایک ایسا باہمت کردار ہے جو وہاں محبت جیسے جرم اور گناہ کبیرہ کی مرتکب ہوتی ہے۔

زر جانان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد گلِ مینہ جو کہ ایک پختہ حوصلے کی مالک تھی ایک مجبور اور لاچار بیوہ کی صورت میں ڈھل جاتی ہے۔

"گلِ مینہ کئی ہفتے بعد تک شدید انتشار کے عالم میں رہی، فہیم کی ماں دو وقت کا کھانا لے کر آتی تھی اور اسے زبردستی کھلا جاتی تھی۔۔۔۔اس کے بعد وہ اکثر زر جانان کی چیزیں الٹ پلٹ کر دیکھتی رہتی تھی۔ اسے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ وہ اس کے آس پاس ہی کہیں موجود ہے اور وہ خیالوں خیالوں میں اس سے باتیں شروع کر دیتی تھی۔"(۵)

ناول میں ایک اور کردار ہے زر جانان جس کے اچھے اوصاف سے متاثر ہو کر پاؤ جان، گلِ مینہ کا رشتہ زر جانان سے طے کر دیتا ہے لیکن قسمت ایسا کھیل کھیلتی ہے کہ شادی سے پہلے پاؤ جان کی وفات ہو جاتی ہے اور گلِ مینہ کا بڑا بھائی لالچ میں آ کر گلِ مینہ کو ایک بوڑھے عطا خان نامی شخص کے ہاتھوں فروخت کرنا چاہتا ہے لیکن گلِ مینہ اس رشتے کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے اور زر جانان کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے گھر چھوڑنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ زر جانان ایک رحم دل انسان تھا اور وہ انسانیت کی دل و جان سے قدر کرتا تھا۔ پیشے کے حوالے سے وہ ڈرائیور تھا لیکن بادشاہت طبیعت کا مالک تھا۔ دل ہی دل میں دونوں ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کی امیدیں دل میں بساتے ہیں لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے، حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہ دونوں اپنے گھروں کو خیر آباد کہہ کر انجانی منزل کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں۔ وہ دونوں میرن شاہ کا رخ کرتے ہیں لیکن راستے میں بہت سی مشکلات کو جھیلنے کے باعث راستہ بھٹک جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ میرن شاہ کی بجائے افغانستان کے ایک علاقے "گنگے کوٹ" پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر بھی ان کی مشکلات کا یہ انبوہ گراں کم نہیں ہوتا ہے لیکن زر جانان نہ خود ہمت ہارتا ہے نہ ہی وہ گلِ مینہ کو ہمت و حوصلہ ہارنے دیتا ہے یہی اس ناول کے کرداروں کی خاص بات ہے بقول احمد حسین مجاہد کے:

"گلِ مینہ کا ہر کردار اپنا پسِ منظر ساتھ لیے نمود ہوتا ہے لیکن اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔"(۶)

اس ناول کی خاصیت یہ بھی ہے کہ یہ ایک نکتے سے شروع ضرور ہوتا ہے لیکن ایک نکتے پر ختم نہیں ہوتا بلکہ کسی ایک نکتے سے پھیل کر پوری کائنات کا احاطہ کر لیتا ہے یہ قلعہ الموت سے شروع ہو کر بے نظیر کے قتل تک پھیل جاتا ہے حسن بن الصباح کے وقت سے لے کر زمانۂ موجود کی ہر دہشت پھیلانے والی سوچ کے چہرے کو بے

نقاب کرتا ہے اور ایسی ہر سوچ کو بے نقاب کرتے ہیں جو مذہب کی آڑ میں دہشت کا پرچار کرتے نظر آتے ہیں جن کے نزدیک نہ کسی مذہب کی کوئی اہمیت ہے نہ ہی کسی مذہبی عبادت گاہ کی۔ زیف سیّد بتانے کی کوشش کی ہے کہ دہشت کا تعلق کسی قوم، فرقے، مسلک یا قبیلے سے نہیں بلکہ سوچ سے ہے۔

اس ناول کا ایک اور اہم کردار فتح خان ہے جو زرجانان اور گلِ مینہ کی محبت کی نشانی ہے، والد کی موت کے بعد جب اس کی ماں حالات کا جبر سہنے کے لیے کسی ستون کا سہارا لیتی ہے جس کے ذریعے وہ ان تلخ حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی ہو سکے لیکن فتح خان اپنی ماں کی مجبوری کو اس کی کوتاہی سمجھ کر اپنے اس مجاہد ازبکی باپ کو قتل کر کے مدرسے سے چلا جاتا ہے۔ وہاں وہ سماج دشمن طاقتوں کے لیے آلا کار بن جاتا ہے، حالات کی تلخی نے اگرچہ اس کردار کو لمحہ بھر کے لیے صراطِ مستقیم سے دور کر دیا تھا، تاہم اس کے اندر کی انسانیت اور اس کی ماں کی تربیت اسے واپس انسانیت کے راستے پر لانے کی کوشش کرتی ہے لیکن یہ کردار ایسا معصوم کردار ہے جو لوگوں کی زندگیاں بچاتے بچاتے خود ختم ہو جاتا ہے۔ مجمع میں جب بھوری داڑھی والا گاڑی کی طرف فائر کرنے کے لیے نشانہ باندھتا ہے تو فتح خان اسے روکنے کی کوشش میں اپنے جسم پر باندھی ہوئی خود کش جیکٹ کی ڈوری کھینچ بیٹھتا ہے جو وہ کھولنے کے حق میں نہیں تھا:

> "اے اے کیا کل لیے ہو؟ فتح نے چیخ کر پشتو میں کہا اور بائیں ہاتھ سے اس کا بازو پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے فتح خان کا ہاتھ جھٹک کر گاڑی کی طرف فائر کر دیا۔ ڈوری فتح خان کی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی پر لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے پہلے انگلی سے ڈوری نکالنے کا سوچا لیکن اس کا وقت نہیں تھا۔ اس نے لڑکے کو قلاوے میں بھر کر ڈوری کھینچ دی۔"(۷)

اس ناول کا ایک اور اہم کردار شفیق پینٹر کا بھی ہے جو ٹرکوں کے پیچھے تصویریں بناتا تھا لیکن وہ اپنے کام میں اس قدر ماہر تھا کہ کسی جیتی جاگتی چیز کو وہ اس کی تمام تر جزئیات کے ساتھ کسی بھی عکس میں ڈھال دینے کا ماہر تھا اس کو ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اغوا کر کے کسی مدرسے کے مولوی کو بیچ دیا گیا، وہاں اسے تمام تر آسائش میسر آتی ہیں اور اسے اپنے برے عزائم کی تکمیل کے لیے اس کے فن کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر اس سے طرح طرح کے نقوش تیار کروائے جاتے ہیں جن میں آسمان کا ایسا ہو بہو نقشہ شامل تھا کہ دیکھنے والوں کو حقیقی آسمان کا گمان ہوتا تھا۔ اس کردار کے ذریعے زیف سیّد نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جب کوئی

ملک حالتِ جنگ میں ہو تو اس ملک کی عام عوام بھی اس جنگ کا حصہ بن جاتی ہے حالانکہ کسی بھی جنگ کے پیچھے خواہ کتنے ہی اہم مقاصد کیوں نہ ہوں ، چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی عام آدمی اس کا حصہ نہیں بننا چاہتا۔ فنِ مصوری، خطاطی، شاعری یا مجسمہ سازی خواہ وہ فنونِ لطیفہ کی کوئی بھی قسم کیوں نہ ہو اس سے جڑا ہوا شخص کبھی بھی کسی ایسی جنگ کا حصہ نہیں بن سکتا جو اس کی اپنی نہ ہو اور جس کا انجام صرف اور صرف تباہی ہو۔ جنگ ہمیشہ جنون کے بل بوتے پر لڑی جاتی ہے لیکن ان کے پس منظر میں کہیں نہ کہیں مفاہمت ضرور ہوتی ہے جس میں ایک عام سے عام شہری بھی اس آگ کا ایندھن بن جاتا ہے جو نہ اس نے لگائی ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے جلنے بجھنے سے اس کو کوئی سروکار ہوتا ہے۔

اس ناول میں تین قسم کی جنتوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے ذریعے بھولے بھالے لوگوں کو بھٹکا کر ان سے اپنے عزائم کی تکمیل کروائی جاتی تھی۔ جن میں ایک مولوی صاحب کی جنت تھی جو اپنے پر اثر واعظ سے لوگوں کے دلوں میں جنت کی شدید خواہش پیدا کر دیتا تھا۔ دوسری جنت شفیق پینٹر کے بنائے ہوئے شاہکار تھے جو لوگوں کو دکھائے جاتے تھے جن سے ان کے دلوں میں جنت کو حاصل کرنے کی طلب جنونیت اختیار کر لیتی ہے اور وہ ان کے کسی بھی دھوکے میں آنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جان قربان کر دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ناول سے اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "لڑکو جنت کی تمنا مسلمان کے دل میں ہونی چاہیے جنت ہر مؤمن کی آخری منزل، ہر دکھ کا حتمی مداوا اور ہر غم کا شافی وکافی علاج ہے۔ جنت ہر مؤمن کے لیے خداوند تعالیٰ کی طرف سے سب سے بڑا تحفہ ہے سب سے خاص انعام ہے، جنت کا مطلب ہے باغ اور اس باغ کا سب سے میٹھا پھل کیا ہے؟ خطب صیب نے اپنا سوال دہرایا اور پھر خود ہی جواب دیا۔ وہ ہے حور۔۔۔۔!حور جنت کا سب سے شیریں پھل ہے لیکن بہت کم لوگوں کو پتا ہے کہ حور کیا ہے۔ آج میں تمھیں بتاتا ہوں سب سے پہلے تو جان لو کہ حور کا قد کیا ہوگا ایک حدیث میں آتا ہے کہ حور کی پلکوں کی لمبائی گدھ کے پروں کی لمبائی کے برابر ہوگی۔"(۸)

بحیثیتِ مجموعی یہ ناول دہشت گردی کے موضوع پر لکھا گیا ایک اہم ناول ہے۔ زیف سیّد اپنے ناول "گل مینہ "کی وجہ سے ہی ادب میں ایک اہم ناول نگار کے طور پر متعارف ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ناول میں کہیں بھی کسی

قسم کا جھول پیدا نہیں ہونے دیتے خواہ وہ جھول مذہبی حوالے سے ہو، تاریخی حوالے سے ہو یا پھر موضوعاتی و فنی حوالے سے وہ ہر چند محنت و مشقت کے ساتھ اس عملی میدان میں طبع آزمائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس ناول کی کہانی ان پہاڑی سلسلوں کے درمیان گونج رہی ہے جو بلندی کے اعتبار سے آسمان کے ساتھ جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور دیکھنے میں بہت دل فریب ہیں۔ لیکن ان پہاڑوں میں آج بھی زندگی کئی بیواؤں اور بے آسرا ماؤں بہنوں کی طرح خاک میں لتھڑی ہوئی ملتی ہے۔ بقول احمد حسین مجاہد کے:

> "زیف سیّد نے میری رگوں کو سرحدی پہاڑی پگڈنڈیوں میں بدل دیا ہے جن پر بے خیالی میں اُگی ہوئی گھاس بھی ہوا کے بارودوں بھرے جھونکوں سے مرجھا کے رہ جاتی ہے۔ یہ کام کوئی زیف سید ہی کر سکتا تھا کہ اس کے ناول کے محرکات اس کے اندر سے پھوٹے ہیں۔"(۹)

زیف سید نے خوب صورت تلازموں، تلمیحات اور تشبیہات کے ذریعے اپنے ناول کو ضخامت کے ساتھ ساتھ ایک بڑا ادبی ناول بنایا ہے۔ ان کا اسلوب اس قدر شائستہ اور بیانیہ ہے کہ کہیں بھی ناول میں قاری اکتاہٹ کا شکار نہیں ہوتا۔ ہر منظر کو اس کی پوری پوری جزئیات کے ساتھ پیش کیا اور ہر کردار سے اس کے مقام و مرتبے کے مطابق کام لیا۔ یہ ناول جس کا خمیر تاریخ کی وساطت سے تیار ہوا ہے لیکن یہ عصرِ حاضر کا ایسا المیہ ہے جو انسانیت کے نام لیواؤں کے منہ پر طمانچہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ زیف سید، گل مینہ، رومیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۲۰۱۹ء، ص۷۸

۲۔ ایضاً، ص:۳۹۷۔۳۹۲

۳۔ ایضاً، ص:۱۲۳

۴ ایضاً، ص:۳۴

۵۔ ایضاً، ص:۲۷۹

۶۔ احمد حسین مجاہد، گلِ مینہ، ایک تاثر، (مضمون) مشمولہ: اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ (جلد اول)، اکادمی ادبیات پاکستان (خصوصی نمبر)، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص:۵۴۹

۷۔ زیف سید، گلِ مینہ، ص:۳۹۶

۸۔ زیف سید، گلِ مینہ، ۲۴۲

۹۔ احمد حسین مجاہد، گلِ مینہ: ایک تاثر، (مضمون)، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص:۵۵۰